سلسلہ اشاعت 11
اگر پاکستان نہ ہوتا!
از
علامہ محمد رضوان احمد نقشبندی
مہتمم جامعہ انوار القرآن
جامعہ انوار القرآن و جامع مسجد مدنی
گلشن اقبال بلاک 5، کراچی فون: 021-34961878
Muhammad Bahadur Hazaryi

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	اگر پاکستان نہ ہوتا!
مصنف	:	علامہ محمد رضوان احمد نقشبندی
تعداد	:	1100
سن اشاعت	:	اگست 2017
صفحات	:	20
ہدیہ	:	-/20

ملنے کے پتے

فدائیانِ ختم نبوت پاکستان

Website: www.khatm-e-nabuwwat.com
E-mail : shaikh_imranulhaq@hotmail.com
Contact : 0333-2281726, 0312-2281726

- ★ جامع مسجد مدنی، بلاک 5 گلشن اقبال کراچی
- ★ جامعہ نضرۃ العلوم، شومارکیٹ کراچی
- ★ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، انفال سینٹر، اردو بازار، کراچی
- ★ مکتبہ رضویہ آرام باغ، کراچی
- ★ مکتبہ برکات المدینہ، بہار شریعت مسجد، بہادر آباد کراچی
- ★ مکتبہ قادریہ نزد فیضان مدینہ مین روڈ پرانی سبزی منڈی کراچی
- ★ اسلامیہ بک سینٹر، نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی
- ★ مکتبہ غوثیہ، ہول سیل، کراچی
- ★ جامع مسجد قباء، سیکٹر 5/G نیو کراچی

حافظ محمد حسن انصاری 0322-2402692

Muhammad Bahadur Hazarvi

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگر پاکستان نہ ہوتا!

یہ بات اب نامعلوم تاریخ کا ہی حصہ ہے کہ دنیا کے جغرافیہ میں ابتک کتنی اور کون کون سی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں ابتک کون کون سے ملک وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔ اگر چہ دنیا کے نقشے میں پہلے ملکوں کی لکیریں اتنی گہری نہ تھیں جتنی کہ اب ہیں۔ اس سے پہلے دنیا اپنی اپنی تہذیب وثقافت کے رنگوں سے پہچانی جاتی تھی۔ جیسے سومیری تہذیب، آریائی تہذیب، قدیم مصری تہذیب، یونانی تہذیب، چینی تہذیب اور قدیم اہل عرب کا کلچر وغیرہ۔ تہذیبوں کی حکمرانی کے اس دور میں ملکی اور جغرافیائی سرحدوں کی تعیین کافی حد تک دھندلی اور غیر واضح دکھائی دیتی ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی (Arnold Toynbee1934-61) نے ساری زندگی کی تحقیقات کا نچوڑ بارہ جلدوں پر مشتمل (A Study of History) میں دنیا کی 26 تہذیبوں کے بارے میں تقابلی مطالعہ کر کے تاریخی اور فلسفیانہ طریقہ سے بحث کے نتیجے میں یہ بتایا ہے کہ تاریخ، اقوام کی بجائے تہذیبوں یا معاشروں کی عکاسی کرتی ہے۔ ٹوائن بی کے مطابق کسی تہذیب کی فنا طبعی یا ماحولیاتی چیلنجوں کی بجائے اخلاقی اور مذہبی چیلنج پورے کرنے میں ناکامی کا نتیجہ ہے۔

لیکن ٹوائن بی سے بھی بہت پہلے 14 ویں اور 15 ویں صدی عیسوی میں ولی الدین عبدالرحمن ابن محمد المعروف بہ ابن خلدون نے علم تاریخ کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا شاہکار مقدمہ ابن خلدون تحریر کر کے تہذیبوں کی اہمیت، انسانی دنیا پر ان کے اثرات اور ان کے عروج وزوال کی فلسفیانہ تحقیق پیش کر کے دنیا کو غور وفکر اور تحقیق وتفتیش کی نئی نئی جہتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تہذیب کا کینوس (Canvas) ملکی تصور کے کینوس سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کی معلوم تاریخ میں تہذیبیں جغرافیائی تبدیلیوں کا سبب بنتی رہی ہیں اور نئے نئے ملکوں کو جنم دیتی رہی ہیں۔ گویا تہذیب اور ملک کے درمیان ماں اور بیٹے کا رشتہ پایا جاتا تھا۔ مگر موجودہ تاریخ میں

استکاالٹ ہوا۔ موجودہ دور میں قومیت اور قوم پرستی کے تصور کو اجاگر کیا گیا اور اس کی بنیاد پر انسانی دنیا کو مختلف چھوٹی چھوٹی جغرافیائی اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

جدید نظریۂ سیاست سے قبل انسان کی شناخت اس کے افکار و نظریات، اس کی سماجی اقدار، تاریخی و تہذیبی روایات اور ثقافتی مظاہر سے ہوا کرتی تھی لیکن سیاست کے جدید نظریہ نے انسان کو ایک اور قسم کی شناخت سے نوازا۔ اس نے انسانی دنیا کو اس کے نظریاتی اور روحانی پس منظر سے الگ کر کے رنگ و نسل اور علاقہ و وطن کے محدود تصور میں جکڑ دیا۔ چنانچہ نظریہ و عمل اور اخلاقی اقدار کی جگہ اب علاقائیت و وطنیت، نسلیت و لسانیت انسانی دنیا میں فرق و امتیاز کا ذریعہ بن گئی۔ یہاں تک کہ گذشتہ صدی عیسوی میں جب استعماریت کے شکنجے سے دنیا نے آزادی حاصل کی تو بالعموم ساری دنیا اور بالخصوص عالم اسلام چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کا وہ نقشہ جو اس سے قبل عالمگیر حکومتوں اور بڑی بڑی تہذیبوں پر مشتمل دکھائی دیتا تھا، سامراجیت کے بعد اس میں چھوٹے بڑے تقریباً 200 ممالک کی بہار نظر آنے لگی۔ جبکہ بعض ممالک تو اتنے چھوٹے چھوٹے رقبوں پر بنائے گئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر یا ان میں گھوم پھر کر یہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی ملک ہے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ یہی چھوٹے چھوٹے ملک چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی جنم بھومی بن چکے ہیں۔

استعماریت اور سامراجیت کے علمبرداروں نے اپنے مذموم مقاصد اور باطل عزائم کی تکمیل کے لیے انسانی دنیا کے عظیم تمدنی اور معاشرتی نظام کا خاتمہ کر کے اس کی کوکھ پر ایسی ضرب لگائی کہ دنیا تقسیم در تقسیم کا شکار ہوتی چلی گئی۔ جس کا سب سے بڑا نقصان اسلامی دنیا کو برداشت کرنا پڑا۔ مسلمانوں کی مرکزی خلافت یعنی خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور ان کی عالمگیر تہذیب رنگ و نسل اور علاقہ و وطن میں منقسم ہو گئی۔ امت کو نام نہاد آزادی کے نام پر چھوٹے چھوٹے پچاسیوں ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس تقسیم و تحلیل کے پیچھے سامراج نے جس نعرہ کا سہارا لیا وہ وطنیت اور قوم پرستی کا نعرہ تھا۔ علامہ اقبال نے اسی نعرہ کو مذہب و ملت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا تھا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور

Muhammad Bahadur Hazarvi

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے

غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے

اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی

رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترکِ وطن سنت محبوب الٰہی

دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں رقابت تو اسی سے

تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے

کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

Muhammad Bahadur Hazarvi

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وطنیت پرستی اور قومیت کے اس نعرہ کی وجہ سے مسلمان پہلے عرب و عجم اور پھر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم در تقسیم ہوکر اپنی اجتماعیت اور مرکزیت سے ایسے بیگانے ہوئے کہ انہوں نے اپنے گرد جغرافیائی سرحدوں کی ایسی لکیریں کھینچ ڈالیں کہ جن کی وجہ سے ان کی نظریاتی وحدت اور تہذیبی شراکت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔ مغربی سازش کا شکار ہوکر قوم پرست لیڈروں نے اسلامی وحدت ملی کے نظریہ کو پس پشت ڈال کر اپنی اپنی جغرافیائی اور علاقائی قومیتوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کمال اتاترک نے ترکی کے مسلمانوں کو محض ترکش بنا کر انکا رشتہ پوری دنیائے اسلام سے کاٹ دینے کی کوشش کی اور جمال عبدالناصر نے مصر کے مسلمانوں کو قدیم مصری تہذیب پر فخر کرنا سکھایا اور انہیں آلِ فرعون کی تہذیبی وراثت کا امین بنا دیا۔ وطن پرستی کی یہ لہر اتنی شدید تھی کہ سارا عالم عرب بشمول سعودی عربیہ اپنی اپنی الگ پہچان کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ایک نظریہ، ایک دین، ایک حرم، ایک کتاب اور ایک رسول کو ماننے والے اب ترکی، مصری، عراقی، ایرانی، سعودی، شامی، لبنانی، سوڈانی، اور افغانی ہونے پر فخر کر رہی ہیں اور قوم پرستی کے خمار سے مست ہوکر ایک دوسرے پر اپنی برتری جتانے میں مگن ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتا جو مسلمان بھی ایک

ملت از وطن است:

قوم پرستی کا یہ مغربی نظریہ جب برصغیر کی سرحدوں کے اندر داخل ہوا تو اس کا منطقی اثر یہ پڑا کہ اس سرزمین پر بسنے والی دو قومیں یعنی ہندو اور مسلم اپنی جغرافیائی وحدت کی وجہ سے ایک قوم سمجھی جانے لگیں۔ یہاں تک کہ برصغیر کی مسلم لیڈر شپ بشمول کانگریسی مولویوں کے اس گمراہ کن خیال کی حامی ہوگئی کہ ہندو اور

مسلم ایک قوم ہیں۔ مشہور دیوبندی عالم، مولوی حسین احمد دیوبندی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ملت از وطن است۔ یعنی ملت وطن سے بنتی ہے۔ جس پر علامہ اقبال برافروختہ ہو گئے اور انہوں نے اس کے جواب میں کچھ یوں ارشاد فرمایا:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بو العجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بو لہبی است

یہی وہ مقام تھا جہاں ابتداً بڑے بڑے مسلم لیڈر بھی وطنیت پرستی اور قومیت کی رو میں بہتے چلے گئے۔ مگر آگے چل کر انہیں بہت جلد اس بات کا تجربہ ہو گیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے اور ہندو ایک الگ قوم ہے۔ سر سید احمد خان ایک زمانے تک ہندو، مسلم اتحاد کی باتیں کرتے رہے۔ وہ ان دونوں کو دو آنکھوں کی طرح سمجھتے تھے اور ایک زمانے تک سرسید کی ساری جدوجہد کا محور متحدہ قومیت کا تصور ہی تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی فکر کا زاویہ بدلنے لگا یہاں تک کہ وہ ایک قومی نظریہ کے تصور سے پوری طرح دستکش ہو کر دو قومی نظریہ کی بات کرنے لگے اور انہوں نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندو مسلم ایک نہیں بلکہ دو الگ قومیں ہیں۔ جو نہ پہلے کبھی ایک ہوئے اور نہ آئندہ کبھی ایک ہو سکتے ہیں۔ ان کا مذہب وعقیدہ ہی الگ الگ نہیں بلکہ ان کی زبان، کلچر، سماجی روایات، عادات واطوار، رسوم ورواج سب کچھ جدا جدا ہیں۔ سرسید احمد خان نے ان تمام باتوں کا بخوبی جائزہ لیا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندو تنگ نظری اور تعصب کا اس حد تک شکار ہے کہ وہ مسلمان کو کسی طور پر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی نظر میں مسلمان ایک ملیچھ یعنی ناپاک قوم ہے۔ اسے مسلمان کی ذات سے ہی نہیں بلکہ اس کی زبان سے بھی اس حد تک نفرت ہے کہ آئے دن اردو اور ہندی کا کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر سرسید احمد خان اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ سے جدوجہد کا

آغاز کیا جائے۔

اسی قسم کا تجربہ بعد میں قائد اعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر اقبال کو بھی ہوا اور انہوں نے بھی ہندو مسلم دونوں کے لیے مشترکہ جدو جہد ترک کر کے اور متحدہ قومیت کے نعرہ سے اپنا دامن چھڑا کر مسلمانوں کے لیے علیحدہ کوششوں کی حمایت شروع کر دی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آنکھ بند کر کے کسی کی تقلید کے نتیجے میں نہیں بلکہ اپنے ذاتی مشاہدہ اور تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے 1934 میں اپنے خطبہ الہ آباد میں پاکستان کے لیے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل علیحدہ خطوں کا ذکر کر کے پہلی مرتبہ پاکستان کا تصور پیش کیا۔

تقسیم ہند سے پہلے ہی نہیں بلکہ تقسیم ہند کے بعد بھی دنیا اسی نتیجے پر پہنچی کہ ہندو بنیادی طور پر ایک متعصب قوم ہے۔ جو اپنے سوا کسی دوسری قوم کو برداشت ہی نہیں کر سکتی کسی دوسری قوم کو برداشت کرنا تو دور کی بات ہے وہ تو اپنے درمیان بھی سماجی تقسیم کا شکار ہونے والے دلتوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو برابری اور مساوات کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ ہندوستان کا نامور وکیل اور سماجی مصلح بھیم راؤ رام جی امبیڈکر (1891-1956ئ) اچھوتوں کے حقوق کے لیے ساری زندگی جدو جہد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ 1935ء میں اس کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہندو مت میں رہتے ہوئے دلتوں کو مساوات کی کوئی امید نہیں اور انہیں بدھ مت اپنانے کو کہا۔ چنانچہ وسیع پیمانے پر تبدیلی مذہب واقع ہوئی۔

اور یہ بات بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ بابری مسجد کے حوالے سے یا گجرات اور احمد آباد میں مسلم کش فسادات کے نتیجے میں یا مقبوضہ کشمیر میں بھارتی جارحیت اور بربریت کے نتیجے میں مسلمانوں کا جتنا خون بہایا گیا ہے اور جس قسم کی سفاکیت اور درندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ ہماری موجودہ نسلوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر کسی کی آنکھ نہ کھلے تو ایسی ہی آنکھوں کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وعلی ابصارھم غشاوۃ (البقرہ:7) ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

پہلے لیڈروں میں ایسی مثالیں موجود تھیں کہ وہ حالات و واقعات کو دیکھ کر ہوش میں آجاتے تھے مگر آج کا لیڈر جو ایک دفعہ اندھا ہو گیا وہ ہمیشہ اندھا ہی رہتا ہے اور آخری وقت تک پوری قوم کو اندھیرے میں رکھنا چاہتا

Muhammad Bahadur Hazarvi

ہے۔ اس لیے کہ آج کا لیڈر بکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ملک اور قوم کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے کام کر رہا ہوتا ہے۔

دو قومی نظریہ:(Two Nation Theory)

وقت نے ثابت کر دیا کہ مسلمانانِ برصغیر کے لیے واحد راستہ دو قومی نظریہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر راستہ تباہی اور بربادی اور ہمیشہ کی غلامی کی طرف لے جانے والا ہے۔ علمائے حق اور دانشورانِ قوم کو صاف دکھائی دیتا تھا کہ مسلمانوں کی آزادی اور خودمختاری، سربلندی اور سرفرازی صرف دو قومی نظریہ سے وابستہ ہے۔
دو قومی نظریہ کی اصطلاح چونکہ برصغیر کے مخصوص سیاسی اور معاشرتی ماحول میں وضع ہوئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے خام خیال مفکروں اور بے بصیرت دانشوروں نے اسے محض ایک سیاسی نعرہ یا حربہ قرار دے کر اس کی اصل روح اور فلسفہ کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض کور باطنوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نہ دو قومی نظریہ کا کوئی وجود ہے اور نہ پاکستان کوئی نظریاتی مملکت ہے۔ اس قسم کی باتیں موجودہ زمانہ کی سوفسطائیت کی بدترین مثالیں ہیں۔ کسی حقیقت کو جھٹلا کر یا اس کے روشن چہرہ پر گرد وغبار کا غازہ مل کر اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ آج دنیا سائنس کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ آج کے دور میں بچہ بچہ جانتا ہے کہ کوئی حقیقت نہ چھپانے سے چھپ سکتی ہے اور نہ مٹانے سے مٹ سکتی ہے۔ اور پھر ایسی حقیقت کہ جو نہ صرف تاریخ کا مسلمہ ہے بلکہ وہ مکمل طور پر دینی، ایمانی اور اعتقادی سچائی کا مظہر بھی ہے۔ ایسی حقیقت کو دنیا کی کونسی طاقت مٹا سکتی ہے۔
قرآن وسنت کی تعلیمات کا سارا فلسفۂ ہدایت جس محور کے گرد گھومتا نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے افراد اور معاشرہ وجود میں آئے جو اپنے افکار ونظریات سے لیکر اپنی زندگی کی تمام ترجیحات تک دوسری قوموں سے مختلف دکھائی دے۔ ایسے افراد اور ایسا معاشرہ جو توحید کا علمبردار اور تعلیماتِ نبوی کا آئینہ دار ہو اور جس پر صرف اللہ کا رنگ چڑھا ہوا ہو۔

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ
(سورہ بقرہ:138)

اللہ کا رنگ اپنا لو اور اللہ کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔

Muhammad Bahadur Hazarvi

رنگ وہی ہوتا ہے جو امتیاز اور تفرد پیدا کرے۔ لہٰذا مسلمان قوم کا اپنا ایک رنگ اور باقی ساری دنیا کا اپنا رنگ ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

اپنی ملت کو قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

مگر خدا کا یہ رنگ عدل اور رحم دلی، ہمدردی اور مساوات، بے لوثی اور خدمتِ خلق سے ہرگز نہیں روکتا۔ بلکہ یہ سب اس کے لازمی اخلاقیات سے ہے۔ اسی لیے مسلم معاشرے میں ہمیشہ سے دوسری اقوام کے ساتھ رواداری کا اصول کارفرما رہا ہے۔ جس کی رو سے مشترکہ مقاصد و مفادات کے حصول کے لیے اشتراک واتحادِ عمل سے کبھی روکا نہیں گیا۔ ہاں البتہ کلی اتفاق یا باہمی امتزاج کہ جو دونوں کو ہر اعتبار سے ایک کردے۔ ظاہر ہے کہ اس کی دین میں کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ ہمارا دین ہی کیا، دنیا کی کوئی بھی قوم کسی دوسری قوم میں اس طرح مدغم ہوجانا گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی شناخت ہی باقی نہ رہے لہٰذا اسلام جو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے وہ کسی کے ساتھ مرج ہوکر اپنی شناخت کیوں کر مٹانا چاہے گا۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ بات ہر صاحبِ نظر پر عیاں ہے کہ دین اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے دوسری قوموں کے ساتھ بقائے باہمی کے اصولوں کی حد تک تو اشتراک یا اتحادِ عمل کی اجازت دی ہے مگر دین کے شعائر یا امت کے مفاد کو خطرہ میں ڈال کر کسی قسم کا معاملہ کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی گئی۔ جہاں کہیں دوسری قوموں کے ہاتھوں شعائر دینی یا امت کے مفاد کو خطرہ لاحق ہوا وہاں مسلمانوں پر اس کے تحفظ کی تدبیر کرنا یا اس فتنہ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا فرض ہوجاتا ہے۔ یہی دو قومی نظریہ کا اصل فلسفہ اور اس کی حقیقی روح ہے۔

ہماری تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ جب کبھی کسی بادشاہ یا حاکم وقت نے مسلم معاشرہ کو تکثیریت (Polarization) یا امتزاجیت (Meregence) کی طرف دھکیلنا چاہا تو علمائے اسلام اور زعمائے ملت نے اس کے خلاف ہمیشہ علم بغاوت بلند کیا۔

چنانچہ جامع مسجد دمشق کے خطیب، شیخ الاسلام حضرت عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ نے شام کے حکمرانوں کے اس فیصلے کی صریح مخالفت کی تھی، جس کے تحت اہل اقتدار نے یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں

Muhammad Bahadur Hazarvi

بلا روک ٹوک اسلحہ فروخت کرنے کی اجازت دی تھی۔ شیخ نے جامع مسجد کے منبر سے صدائے حق بلند کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حکمرانوں کی یہ تجارت عالم اسلام کے لیے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ کیونکہ کل یہی اسلحہ مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوسکتا ہے۔ انہوں نے فتویٰ صادر فرمایا کہ فرنگیوں کے ہاتھوں اسلحہ فروخت کرنا حرام ہے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام مسلمانوں کے حقیقی پیشوا اور قوم کے حقیقی راہنما تھے۔ لاکھوں فرزندانِ توحید ان کے عقیدت منداور جانثار تھے۔ وقت کے بے بصیرت حکمرانوں کوان کے فتوی سے خطرہ محسوس ہوا توانہوں نے شیخ کو جامع مسجد کے منبر سے معزول کر کے نظر بندی کے احکامات جاری کردیئے۔ مگر شیخ الاسلام کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی اور وہ بدستور اپنے مؤقف پر قائم رہے اور مسلم معاشرے کی بقا اور تحفظ کی جنگ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سرخرو کردیا۔

خلیفہ مامون کے مقابلہ میں حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا سینہ سپر ہوجانا اور اسلامی فکر پر یونان کے باطل فلسفہ کا رنگ نہ چڑھنے دینا اور اسی طرح یونانی فلسفہ وحکمت کی مسلمانوں کے درمیان باقاعدہ ترویج و اشاعت کے وقت اسلامی افکارونظریات کی خالصیت اور بے آمیزی کولاحق خطرات سے بچانے کے لیے امام ابوالحسن اشعری، حضرت امام غزالی اور امام فخرالدین رازی جیسے بڑے بڑے آئمہ محققین کا قلمی جہاد فرمانا۔ نظریہ اسلام کی حفاظت کا تاریخی تسلسل ہے۔

جہاں تک دوقومی نظریہ کے تشخص اور تعین کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں دوقومی نظریہ کی بنیاد کو واضح پہچان اس وقت حاصل ہوئی جب مغل شہنشاہ اکبر نے ہجری تقویم کے ہزارۂ دوم کے آغاز پر، تاریخ میں پہلی دفعہ دوقومی نظریہ کی روح کو جزوی یا فروعی طور پر نہیں بلکہ کلی اور اساسی طور پر منسوخ کر کے یہ اعلان کیا کہ نئے ہزاریئے کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے دوسری قوموں کے ساتھ اتحاد، اشتراک اور امتزاج کی ساری حدوں کو پار کر کے ایک ایسے طریقے کی بنیاد رکھی جس میں تمام ادیان کو برحق مان کر سب کے اشتراک وامتزاج سے ایک نئے دین کی صورت گری کی گئی۔ جس کو بادشاہ نے اپنے گمانِ باطل کے مطابق دین محمدی کے بالمقابل ایک نیا دین بنا کر پیش کیا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کے الحاد و بیدینی کی کوئی اور مثال اس سے پہلے ہمیں نظر نہیں آتی۔ اب تک دین کی بعض تعبیرات سے اختلاف یا بعض نصوص کی من پسند اور من

Muhammad Bahadur Hazarvi

گھڑت تاویلات کر کے دین میں تحریف وتبدیل کے ارتکاب کی تو بہت سی مثالیں پائی گئی تھیں ۔لیکن پورے دین کو منسوخ کر کے رسالتِ محمدی کی عالمگیریت اور ہمہ گیریت کو چیلنج کرنے کی یہ مثال چشم فلک نے پہلی بارہی مشاہدہ کی تھی ۔ چنانچہ غیرتِ حق جوش میں آئی اور برصغیر کی تاریخ کے اس سب سے بڑے فتنے کا قلع قمع کرنے اور دین حق کی آفاقیت اور نبوتِ محمدی کی ابدیت وہمہ گیریت کے نقوش کو پھر سے تابندہ وپائندہ کردکھانے کے لیے سرزمینِ سرہند سے ایک مردِ حق آگاہ یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو کھڑا کردیا۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار

اکبر کے فوت ہوجانے کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر اس کے تخت وتاج کا وارث قرار پایا۔ جہانگیر نے اپنے باپ کی تمام پالیسیوں کو برقرار رکھا، جس کے نتیجے میں حالات جوں کے توں رہے اور الحادو بے دینی کے فروغ میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی ۔مگر اس سے قبل کہ اکبر کے عزائم کے مطابق الحادو بے دینی کی یہ لہر آنے والی نسلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاح امت اور تجدید واحیائے دین کی عالمگیر تحریک نے اہل ہند کو اپنی آغوش میں اس طرح لے لیا، جس طرح آندھی اور طوفان کے اٹھنے کے وقت ایک پرندہ اپنے بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لیتا ہے۔

آپ کے ہمہ جہت انقلاب نے بجا طور پر تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ دین برحق کی بنیادوں کو پھر سے مستحکم کر کے شعائر اسلام کو جو مٹا دیئے گئے تھے دوبارہ بحال کروادیا۔ دین میں جو کچھ خرافات شامل کردی گئی تھیں انہیں اپنی عام کردہ بصیرت کے ذریعے چھلنی کی طرح چھان کر دین سے الگ کردیا اور سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ وحدت ادیان اور وحدت اقوام کے باطل، غیر حقیقی اور غیر عقلی تصور کی بیخ کنی کر کے اسلام کو تمام ادیان سے ممیز وممتاز اور مسلمان کو تمام عالم سے جدا اس کی اصل پہچان کے ساتھ متعارف کروایا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی وہ سب سے بڑا کارنامہ ہے جس نے ایک طرف تو آپ کی شخصیت کو

Muhammad Bahadur Hazarvi

تجدید واحیائے دین کی تاریخ میں نہایت بلند مقام پر فائز کردیا اور دوسری طرف دوقومی نظریہ کی روح کو ایسی زندگی اور توانائی بخشی کہ جس کی بدولت آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے حق و باطل کے درمیان فرق کرنا آسان ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ تین سو سال کے بعد بھی اپنے زمانے کے حالات کو دیکھ کر حضرت مجدد پاک کے فیضان کی دہائی دیتے نظر آتے ہیں۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

برصغیر کے حالات:

سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تاریخی لحاظ سے برصغیر دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں ایک مخصوص پس منظر کا حامل ہے۔ یہاں مختلف رنگ ونسل اور عقیدہ و مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہزاروں سالوں سے آباد چلے آتے ہیں۔ یہاں کی قدیم ترین آبادی موہن جودڑو کے آثار پانچ ہزار سال پرانے ہیں۔ برصغیر میں سب سے پہلے آکر آباد ہونے والی وہ آریائی اقوام ہیں جو وسط ایشیا سے اٹھ کر دریائے سندھ کے کنارے یہاں آکر آباد ہوگئی تھیں۔ آریائی قومیں بعد کی تاریخ میں تو نہ جانے کہاں گم ہیں۔ البتہ ان کے بعد یہ سرزمین مختلف رنگ ونسل اور عقیدہ ومذہب کے لوگوں کا گہوارہ بن گئی۔ بدھ مت کی بانی گوتم بدھ اور سکھوں کے گرو، بابا گرونانک کی پیدائش بھی اسی سرزمین پر ہوئی۔ اس طرح برصغیر کی سرزمین مختلف مذاہب کی جنم بھومی بن گئی۔ آریائی اقوام سے بت پرستی کی تعلیم لیکر یہاں کے ہندوؤں نے ہندوستان کی دھرتی کو دھرتی ماتا کا درجہ دے الا۔ اور کروڑوں دیوی، دیوتاؤں، اوتاروں اور بھگوانوں کی پرستش شروع کردی، جس کے نتیجے میں یہاں ہندومت اور دیگر مشرکانہ مذاہب وجود میں آگئے۔ انبیائے کرام کی تعلیمات اور آسمانی کتابوں کی ہدایت کو راموش کردیا گیا اور اس کی جگہ مختلف ویدیں، رامائن اور گرنتھ صاحب جیسی چیزیں رائج ہوگئیں۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں برصغیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور یہاں باقاعدہ اسلام کا نور داخل ہوگیا۔ 712ء یعنی پہلی صدی ہجری کے اواخر میں عظیم فاتح اور سپہ سالار محمد بن قاسم سرزمین برصغیر میں داخل

ے مقام پر لشکر انداز ہو چکا تھا۔ راجہ داہر کے ہاتھوں عرب سے تعلق رکھنے والے چند مظلوم خاندانوں، جن
میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے، کی فریاد مجاہدین اسلام کے یہاں آنے کا سبب بن گئی۔ راجہ داہر مارا گیا اور
اس کی دھرتی کے بہت سے علاقے مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئے۔ یہاں کے باشندوں نے جب مسلمان
فاتحین کے عدل وانصاف، رحم دلی، اور حسنِ سلوک کا مشاہدہ کیا تو ان کے دل خود بخود اسلام کی محبت سے بھر
گئے۔ صوفیاء ومشائخ کی آمد کے بعد یہاں دین کی تبلیغ عام ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق حلقہ
بگوش اسلام ہونے لگے۔ حجاز مقدس، فارس، وسط ایشیا، ایشیائے کوچک اور افغانستان اور خراسان سے آنے
والے صوفیاء اور مشائخ، علماء اور مصلحین نے برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچ کر دین کی روشنی کو جس انداز سے
پھیلایا، صحابہ وتابعین کے بعد اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ علامہ اقبال اس سرزمین پر اسی لیے
نازاں ہوئے:

چمکے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دیکے کس نے چمکائے کہکشاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

صوفیاء ومشائخ کی برکت سے یہاں تعلیم وتربیت کا سلسلہ ایسا عام ہوا کہ جا بجا مساجد ومدارس اور خانقاہیں
قائم ہوگئیں۔

برصغیر پاک وہند کی سرزمین پر ایک طرف تو مسلمانوں نے تعلیم وتربیت کا عظیم الشان سلسلہ قائم فرمایا جس کی
برکت سے سرزمین ہند جو اس سے قبل بت پرستی، باطل اوہام اور جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، اب ظاہری
وباطنی علوم کی روشنیوں سے جگمگانے لگی۔ دوسری طرف مسلمانوں نے سیاسی حوالے سے بھی یہاں عظیم الشان
حکومتوں اور بادشاہتوں کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز معزالدین محمد بن سام کے ہاتھوں
ہوا۔ ایبک سے التمش تک اور التمش سے بہادر شاہ ظفر تک کتنے ہی سلاطین ہوئے جنہوں نے ساحل مکران
سے خلیج بنگال تک جنوبی ایشیا کے اس خطے کو کم وبیش ساڑھے سات سو سال تک تہذیب وتمدن کا ایک ایسا گہوارہ

Muhammad Bahadur Hazarvi

بنا کر رکھا کہ جس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے صوفیائے، بڑے باکمال علماء، نامور ادباء و شعراء، بڑے بڑے اہل فن اور عظیم دانشوروں نے پرورش پائی۔ مشہور مورخ اور سیاح الیگزنڈر ہملٹن کے مطابق صرف ٹھٹھہ شہر میں علوم وفنون کے چار سو مدارس قائم تھے اور مورخ مقریزی کے مطابق دارالسلطنت دہلی میں ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے۔ ان بادشاہان وقت کی ذاتی زندگی کا معیار جو بھی رہا ہو مگر ان میں ایک بات قدر مشترک تھی کہ انہوں نے امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام کو لازم رکھا اور علوم وفنون کی سرپرستی سے کبھی دستکش نہ ہوئے۔

انگریزوں کا دورِ حکومت:

مسلم معاشرہ میں دراڑیں کیسے پڑ گئیں اور انگریزوں کو جنوبی ایشیا کے اس خطے میں غلبہ کیسے حاصل ہو گیا یہ ایک طویل داستان ہے جس کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہماری اندرونی کمزوریوں، حکمران طبقے کی عیاشیوں اور زمانے کی چالوں سے بے خبر رہنے کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ایک نہایت چالاک، فریب کار اور دھوکہ باز قوم نے منافقت اور مکاری اور کذب وفریب کا لبادہ پہن کر ہمیں اندر سے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا جس طرح سیم تھور زمین کے اندر پھیل کر اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ غرض انیسویں صدی کے وسط میں یہ عیار و مکار قوم برصغیر پر قابض ہو گئی۔ اعلیحضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا تھا:

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے
سونے والے جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے

1857ء کی جنگ آزادی کے موقع پر دھرتی کے فرزندوں نے اپنی دھرتی کو آزادی دلانے کے لیے عظیم قربانیوں کی تاریخ رقم کر دی۔ اس سے پہلے حیدر علی، ٹیپو سلطان اور نواب سراج الدولہ جیسے بہادر بھی اپنے وطن کی آزادی کے لیے جد وجہد اور قربانیوں کی لازوال مثالیں قائم کر چکے تھے۔ یہ علماء ومشائخ اور اہل دین ہی تھے جنہوں نے ہر موقع پر وطن سے وفاداری کا رشتہ نبھا کر بتایا اور اس کی محبت کا قرض ادا کیا۔ دوسری طرف

دھرتی ماتا کے پجاریوں نے اپنی دھرتی ماں کے ساتھ ایسی بے وفائیاں دکھائیں کہ اگر آج اس ماں کو قوت گویائی مل جائے تو وہ سب سے پہلے انہیں غداروں اور بے وفاؤں کو اپنے اوپر سے نکل جانے کا حکم صادر کرے۔

مگر مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر ہندوستان کے لیے قربانیاں دیں۔ انہوں نے انگریز کے غاصبانہ قبضہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑے بڑے نامور علماء اور مشائخ علم جہاد بلند کرتے ہوئے میدان میں اتر آئے جس کی وجہ سے انہیں پھانسیاں ہوئیں اور کالے پانی (جزیرۂ انڈیمان) کی سزائیں سنائی گئیں۔ تحریک آزادی کے سب سے بڑے مجاہد علامہ فضل حق خیر آبادی نے اسی جزیرہ میں قید کے دوران وصال فرمایا۔ حضرت مولانا کفایت علی کافی رحمۃ اللہ علیہ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ انہوں نے پھانسی کے پھندے کے سامنے بھی سامراج کے آگے سر نہ جھکایا۔ سر جھکانا تو دور کی بات ہے آپ نے تو بر سر دار دشمن کو فی البدیہہ یہ پیغام پہنچایا:

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا
اطلس و کم خواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تن بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پہ سخن رہ جائے گا

تحریک آزادی کے مجاہدین میں علامہ فیض احمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عنایت احمد کاکوری رحمۃ اللہ علیہ مفتی صدر الدین آزردہ، مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا عبد الجلیل شہید علی گڑھی علیہ الرحمہ جیسے اکابرین کی قربانیاں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

Muhammad Bahadur Hazarvi

انگریز تقریباً ڈیڑھ سو سال تک ہندوستان پر قابض رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ اسلامیانِ ہند کے لیے نہایت تکلیف دہ اور صبر آزما تھا۔ مسلمانانِ برصغیر کے لیے دوہری آزمائش تھی۔ اس لیے کہ ایک طرف تو انگریز حکومت انہیں اسلام اور تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کرتی تھی اور دوسری طرف ہندو ساہوکارانہ ذہنیت مسلمانوں سے ان کے ہزار سالہ دور حکومت کا بدلہ لینے کے لیے پر تول رہی تھی۔ انگریزوں کی حکومت اور ہندوؤں کی اکثریت کے درمیان مسلم کمیونٹی کی حیثیت سینڈوچ کی مانند دکھائی دیتی تھی۔ تحریک آزادی ہند کے موقع پر دھرتی ماتا کے بچاریوں نے مسلمانوں کے ساتھ منہ پہ رام رام اور بغل میں چھرے والا سلوک کر کے انہیں ظالم حکمرانوں کے شکنجے میں جکڑوانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ انہوں نے پوری منافقانہ چابکدستی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو تنہا چھوڑ کر انگریز سرکار سے اپنا ناطہ جوڑ لیا اور سامراجی قوتوں کو جلد از جلد یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سرکار کا غدار تو صرف مسلمان ہے۔ جہاں تک ہندو کا تعلق ہے وہ تو کل بھی سرکار کا وفادار تھا اور آج بھی اس کا بہی خواہ ہے۔ دوسری طرف اسی ہندو بنیئے نے چوغہ بدل کر مسلمانوں سے ہاتھ ملایا اور دھرتی ماتا کی قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندو اور مسلم دونوں اس دھرتی کے فرزند ہیں۔ لہٰذا دونوں بھائی بھائی ہیں۔ ہمیں بھائیوں کی طرح مل کر حکمرانوں کے خلاف اس وقت تک تحریک چلانی ہے جب تک ہم ان حکمرانوں کو اپنے دیس سے نکال نہیں دیتے۔

برصغیر کی تاریخ میں مسلم قوم کے لیے شاید سب سے مشکل وقت یہی تھا ایک طرف ظالم حکومت کی منتقمانہ پالیسیاں تو دوسری طرف ہندو قوم کی منافقانہ چالیں اور ریشہ دوانیاں۔

مسلمانانِ ہند جیسا کہ ذکر کیا گیا تاریخی طور پر انتہائی زوال پذیر دور سے گزر رہے تھے اور بقول الطاف حسین حالی ان کا حال یہ تھا:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کہ مد ہے ہر جزر کے بعد

Muhammad Bahadur Hazarvi

ان حالات میں سارا مسلم معاشرہ اس ریوڑ کی مانند ہو چکا تھا جسے گلہ بان کے بغیر بھیڑیوں کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ مسلمانوں کے لیے ترقی کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ انہیں ان کے مناصب اور ملازمتوں سے زبردستی سبکدوش کیا جانے لگا۔ ان کے مذہب اور رسومات کا کھلے عام مذاق اڑایا جاتا۔ شعائرِ اسلام کی دل کھول کر توہین کی جاتی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں سور چھوڑ دیئے جاتے اور قرآن پاک کی بے حرمتی کی جاتی۔ شدھی اور شنگٹھن جیسی انتہا پسند تحریکیں چلا کر مسلمانوں کو ہندو مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ عیسائی مشن کھلے عام عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے۔ جن کی دیدہ دلیری اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ انگلستان سے پادری فنڈر اپنے ساتھ عیسائی مشنریز کی ایک جماعت لے کر چلا آتا ہے اور خلیج بنگال سے دہلی کی جامع مسجد تک مسلمانوں کو مناظرہ کا چیلنج کرتا پھرتا ہے۔ خدا رحمت کرے مولانا رحمت اللہ کیرانوی پر کہ جنہوں نے اس کا چیلنج قبول کر کے پوری دنیا کے سامنے اس سے مناظرہ کیا اور اسے ایسی ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا کہ پادریوں کا منہ کالا ہو گیا اور وہ کھلے عام اپنی شکست کا اعتراف کر کے دوبارہ انگلستان سدھار گئے۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو انگریز سرکار اور اس کی ناز بردار ہندو رعایا دونوں نے مل کر مسلمانوں کے درمیان اختلافات اور فرقہ واریت کو ہوا دینا شروع کر دی۔ یہی وہ نازک وقت تھا جب شانِ رسالت جیسے معاملہ کو متنازعہ بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ نور و بشر، علم غیب، حاضر و ناظر، حیات النبی، ندائے یا رسول اللہ، استعانت، رفع یدین، آمین بالجہر، نیاز و فاتحہ اور درود و سلام جیسے موضوعات جن پر تاریخ میں کبھی کسی نے نہ اختلاف کیا تھا اور نہ کوئی جھگڑا پیدا کیا تھا۔ ان میں اختلاف کر کے مختلف فرقے، گروہ اور جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ قادیانیت کا ناپاک بیج بھی انہی ایام میں بویا گیا اور ختم نبوت جیسے متفقہ معاملہ پر مسلمانوں کو باہم لڑایا گیا۔ پرویزیت، چکڑالویت، غیر مقلدیت جن کا تصور بھی مسلمانانِ ہند کے وہم و گمان سے نہ گزرا تھا، مسلمانوں کے درمیان فروغ پا رہے تھے۔ شانِ رسالتمآب ﷺ میں ایسی تعبیریں ضبطِ تحریر میں لائی گئیں۔ جن کو پڑھ کر ایمان کا کلیجہ چاک ہو جاتا ہے۔ گستاخی و بے ادبی جو کافروں کا شیوہ تھا مسلمان کہلانے والوں کے گلے کا ہار بنا کر ڈال دیا گیا۔ ان تمام کارروائیوں کے پیچھے باطل کے عزائم تو یہ تھے کہ مسلمانوں کے سینوں سے

Muhammad Bahadur Hazarvi

عشق رسول ﷺ کی شمع کو نکال کر پھینک دیا جائے۔ان کا تعلق اپنی توحید سے باقی رہتا ہے تو رہے مگر ذات رسالتمآب اور عشق رسول ﷺ کی اہمیت کم سے کم ہوتی چلی جائے۔دنیا میں ذات رسالتمآب کو نشانہ اس لیے بنا یا گیا کہ ڈیڑھ ہزار سال سے یہود و نصاریٰ حسد و دشمنی کی جس آگ میں جل کر خاک ہوئے جاتے ہیں اس کا تعلق آپ ﷺ ہی کی ذات سے ہے۔ان کی عداوتیں اور جھگڑے خدا کے ساتھ نہیں بلکہ خدا کے رسول کے ساتھ ہیں۔ان کا مشن یہ ہے کہ:

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو

مگر خدائے ذوالجلال "ورفعنالک ذکرک" کی شان پھر دنیا کو دکھانا چاہتا تھا۔چنانچہ بریلی سے اعلیحضرت امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن نے عشق رسالتمآب کے فیضان کے دریا بہانے شروع کر دیئے اور اپنی تمام علمی اور عملی کاوشوں کا محور اور مرکز عشق رسول ﷺ کو بنالیا۔علامہ اقبال بھی وقت کی اس نزاکت کو خوب سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی شعر و سخن کے دھارے اس جانب بہا کر رکھے اور دنیا کو صاف صاف یہ پیغام پہنچایا:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کردے

ایں ہمہ بیرونی سازشوں اور اندرونی کمزوریوں کے باعث مسلم معاشرہ انحطاط اور تحلیل کی ایسی کیفیت سے دوچار تھا کہ ہر طرح کے بیرونی اثرات اس میں در آتے تھے۔ چنانچہ مغرب کا قوم پرستی کا تصور (Nationalism) جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

دنیا کے بیشتر ممالک رنگ و نسل، خاندان اور برادری ازم کی بنیاد پر قائم ہوتے جا رہے تھے۔مغرب نے اپنے

Muhammad Bahadur Hazarvi

زعم فاسد میں نظریاتی قوتوں کوشکست دے دی تھی اور اقوام عالم کو نئی بنیادیں فراہم کردی تھیں۔جس کے نتیجے میں اسٹیٹ اور مذہب کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا اور خلافت جیسا نظام محض خواب وخیال بن کر رہ گیا تھا۔خصوصاً مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر کے انہیں ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رکھنے کے لیے راہ ہموار کردی گئی تھی۔مذہبی آئیڈیالوجی (Idealogy) کو قومی دھارے سے خارج کر کے اسے انسان کا ذاتی مسئلہ بنادیا تھا اور اس کی جگہ سیکولرازم کو ساری دنیا کا مشترکہ مذہب قرار دیا گیا تھا۔سیکولرازم سے مراد دنیا کا وہ نظام ہے جس میں خدا اور مذہب کا تصور باقی نہیں رہتا۔20 دیں صدی کا یہی وہ سب سے بڑا شیطانی کھیل تھا جس کی بنیاد پر بعض بے دینوں نے یہاں تک کہنا شروع کردیا کہ ہم نے اپنی دنیا سے خدا کو خارج کر دیا ہے۔نعوذ باللہ من ذالک۔

قوم پرستی کے انہی گمراہ کن تصورات کے زیراثر برصغیر کی ناعاقبت اندیش اور حقیقت ناشناس قیادت نے ہندو اور مسلمان کو ایک قوم قرار دے دیا اور ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگایا۔متحدہ قومیت کا یہ وہ نامعقول اور غیر فطری نظریہ تھا جس کا تجربہ اس سے قبل سرسید احمد خان اور دیگر سیاسی راہنما بھی کر چکے تھے۔مگر جیسا کہ روایت چلی آتی ہے کہ بعد والے اپنے پیشروؤں سے کبھی نہیں سیکھتے اسی لئے نامعقولیت کا سفر جاری رہا اور آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی حسین احمد مدنی جیسے لوگ آخری وقت تک کانگریس کے ہمنوا بنے رہے اور یہ بات بھی کسی لطیفے سے کم نہیں کہ وہ صاحبانِ جبہ ودستار کہ جن کے فہم اسلام کے مطابق عام مسلمان تو انبیاء واولیاء کی تعظیم کرنے کی وجہ سے مشرک قرار پاتا تھا مگر ہندو بت پرستوں کے ساتھ ان کا فکری اور عملی اتحاد ایسا مضبوط تھا کہ ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ ان کی جدوجہد کا نصب العین قرار پایا۔اتحاد و یگانگت کے اس رشتہ کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ہندوؤں کو مسجدوں میں دعوت دی گئی اور ان کے لیڈروں کو منبروں پر بٹھایا جانے لگا۔مسلمانوں کے جلسوں میں بھارت ماتا کی جے پکاری جاتی اور ہندوؤں کی خوشی کے لیے مسلمانوں کو گاؤ کشی سے روکا جاتا۔ان راہنمایانِ گم گشتہ راہ نے ایک طرف تو غیر مسلموں کے بارے میں دوستی اور تعلق کے حوالے سے قرآن حکیم کی نصوص کو بالکل فراموش کر کے رکھ دیا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں کی مسلم دشمنی، بدعہدی، دھوکہ دہی اور عیاری و مکاری کی پوری تاریخ سے اپنی

آنکھیں اس طرح بند کر لی تھیں جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں میچ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔
بہر حال نظریۂ وطنیت و قومیت کی عالمگیر لہر یا سیکولرائزیشن کی بین الاقوامی سازش یا ہندوستان میں متحدہ قومیت کا خطرناک کھیل ان سب کا جواب دو قومی نظریہ تھا۔ دو قومی نظریہ جو عین مذہب کی روح اور قرآن و حدیث کا پیغام ہے، ان تمام گمراہیوں کے بیچ، واحد سیدھی راہ تھی۔ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ کا نعرہ دو قومی نظریہ کے تصور سے ہی پیدا ہوا تھا۔ یہی وہ نعرہ تھا جس نے تمام تعصبات، فرقوں، مسلکوں، رنگوں، نسلوں اور برادریوں کو مٹا کر ہمیں ایک ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا تھا کہ جس سے ٹکرا کر اندرونی اور بیرونی گمراہیوں کی ساری نمائندہ طاقتیں پاش پاش ہوگئی تھیں۔ یہ ہدایت کی سیدھی راہ تھی اس لیے علمائے حق خود بخود اس راہ پر گامزن ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے قائداعظم کے شانہ بشانہ تحریک پاکستان کو اپنا مشن قرار دیا اور قیام پاکستان کو عالم اسلام اور اہل حق کی فتح سے تعبیر فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے ذرا پہلے بنارس میں سنی کانفرنس کے عنوان سے ایک اجتماع ہوا جس میں کم و بیش پانچ ہزار علماء و مشائخ نے حصہ لیا۔ اس موقع پر حضرت محدث اعظم سید محمد کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے علماء و مشائخ کا تیار کردہ دستورِ پاکستان پڑھ کر سنایا اور صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اعلان کے ساتھ پاکستان کے لیے اپنے عزم کا اظہار فرمایا کہ "اگر بالفرض محمد علی جناح پاکستان کے مطالبہ سے دستبردار بھی ہوجائیں تو بھی ہم پاکستان بنا کر رہیں گے"۔

جن علمائے حق نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، صدر الشریعۃ حضرت مولانا امجد علی اعظمی، حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خان صاحب، سفیر پاکستان، مبلغ اسلام، حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی، محدث اعظم ہند حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی، امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، مجاہد ملت حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی۔ ان چند علماء کے علاوہ اور بہت سے علماء اور اس وقت کی مشہور خانقاہوں نے بھی بھرپور طریقے سے اس تحریک میں حصہ لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ علمائے اسلام اور مشائخ عظام تحریک پاکستان میں حصہ نہ لیتے اور سیاسی قائدین کے شانہ

بشانہ کھڑے نہ ہوتے تو شاید پاکستان کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

نظریۂ پاکستان کی سچائی، قائداعظم محمد علی جناح کی دیانتدار اور مخلص قیادت اور علمائے حق کی غیر متزلزل حمایت نے برصغیر کے عوام کی رگوں میں وہ جذبہ دوڑا دیا کہ جس نے بیس لاکھ قربانیوں کی پرواہ کئے بغیر ہزاروں خاندانوں کے اجڑنے، بکھرنے اور تباہ ہونے اور ان گنت ماؤں، بہنوں، اور بیٹیوں کی عصمت برباد ہو جانے کے باوجود پاکستان کو ایک حقیقت بنا کر چھوڑا۔

14 اگست 1947ء کو 27 رمضان المبارک، شب قدر کی بابرکت گھڑیاں تھیں جن میں اللہ تعالی نے مسلمانانِ ہند کو پاکستان کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ پاکستان اس وقت کی اسلامی دنیا میں سب سے بڑی مملکت کے طور پر وجود میں آیا۔ پاکستان محض تقسیم ہند کا نام نہیں۔ نہ وہ محض ایک جغرافیائی تبدیلی ہے اور نہ محض ایک لکیر ہے جو دو ملکوں کے درمیان کھینچ دی گئی ہے۔ بلکہ پاکستان ایک نظریہ کا نام ہے اس اعتبار سے وہ ایک مملکت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے۔ اسی لیے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

پاکستان تو اسی دن وجود میں آ گیا تھا جس دن یہاں پہلا آدمی مسلمان ہوا تھا۔

پاکستان اسلام کا قلعہ ہے یہ دنیا کی واحد مملکت ہے جو خدائے لم یزل کے نام پر وجود میں آئی ہے۔ یہ ان تمام کافروں، ملحدوں، بے دینوں اور خدا کے دشمنوں کا منہ توڑ جواب ہے جنہوں نے خدا کے بغیر اپنی دنیا بسانے کی بات کی تھی۔ پاکستان کو ایک نظریہ نے جنم دیا تھا۔ وہ لوگ جو رنگ و نسل اور وطن پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو گئے تھے، پاکستان نے انہیں نظریہ کی قوت و طاقت اور اس کی پہچان کا راز سمجھا دیا۔ پاکستان کا وجود اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے۔ جس کا اپنا آئین، دستور اور نظام حیات ہے۔ پاکستان عالمی اخوت، عالمگیر مساوات، عدل اجتماعی اور احترام آدمیت کے لافانی اصولوں کا ترجمان ہے۔ خدا اس ملک کو سلامت رکھے اور جو اس ملک کی سلامتی چاہے خدا اس کو بھی سلامت رکھے۔

آمین بجاہِ النبی الامین الکریم ﷺ

Youtube اور Facebook پر

علامہ صاحب کے بیانات کے کچھ خاص موضوعات

Allama Muhammad Rizwan Ahmed Naqshbandi

- اللہ دیکھ رہا ہے
- اسلام امن پسند لیکن کب
- انبیاء کی وراثت
- شیطان کا کام
- امام اعظم کا تقویٰ
- قومِ لوط پر عذاب کا منظر
- انسان کی کمزوریاں
- صدقات کی برکات
- انسان کی کمزوریاں
- ایسے ہوتے ہیں حکمران
- فاتح اعظم محمد بن قاسم
- درسِ قرآن (سورۃ البقرہ)

- اسلام کا نظریہ توحید
- تجھے یک نے یک بنایا
- مومنین کی صفات
- فلسفہ شہادت امام حسین
- غضب رسیدہ قومیں
- اندھی تقلید
- مال کا وبال
- استغفار کی کنجی
- آخر یہ ظلم کس لئے
- بگ بینگ تھیوری
- کیا پوری امت مشرک
- درسِ قرآن وحدیث

Muhammad Bahadur Hazarvi

علامہ صاحب کے قلم سے
تربیت کا ایک منفرد انداز
بنام

دینی و اصلاحی، علمی و فکری

مقالات و مضامین

از
علامہ محمد رضوان احمد نقشبندی
مہتمم جامعہ انوار القرآن گلشن اقبال بلاک 5 کراچی

ناشر
علیمیہ پبلشرز کراچی

Muhammad Bahadur Hazarvi